سید محمد حسین فضل اللہ

تہذیبوں کے درمیان مکالمہ

[جب سے امریکی دانشور جناب سموئیل ہنٹنگ ٹن نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نظریہ پیش کیا ہے، اِس کی بازگشت مغربی اور اسلامی دنیا میں برابر سنائی دے رہی ہے۔ سید محمد حسین فضل اللہ شیعی پس منظر رکھنے والے عالم ہیں۔ اُنہیں تبلیغ و دعوت کا خاصا تجربہ حاصل ہے۔ اُن کے قلم سے چند کتابیں نکل چکی ہیں، اور اِن میں سے اکا دکا اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ کچھ عرصے پہلے اُن کا مندرجہ ذیل انٹرویو دو ماہی ''رسالت'' (کراچی) نے شائع کا تھا جو معاصر مذکور کے شکریے کے ساتھ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت'' کے قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔ مدیر]

سوال: گفتگو [یا مکالمے] کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے اور قرآن کریم اس بارے میں کیا اصول دیتا ہے؟

جواب: ہم نے ہمیشہ کہا ہے اور اب بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ دین میں ابتداء ہی سے گفتگو اور افہام و تفہیم کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جب ابلیس نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو خداوند عالم نے اس سے بات چیت کی، اس کی بات سنی اور اسے جواب دیا۔ اس کے بعد جب ابلیس نے خدا سے مہلت طلب کی تو اللہ نے اس کی یہ درخواست قبول کی اور اسے مہلت دی اور اس پر واضح کیا کہ وہ لوگوں پر مطلق اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔ ''**ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الامن اتبعك من الغاوین**'' (میرے بندوں پر تیرا کوئی اختیار نہیں ہے سوائے ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کرنے لگیں۔ سورہ الحجر: ۴۲)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب خداوندِ عالم نے آدمؑ کو خلق کرنا چاہا تو فرشتوں سے بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ ''انی جاعل فی الارض خلیفة '' (میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں - البقرہ: ۳۰)، اس کے بعد فرشتوں نے خدا سے سوال کیا اور خدا نے ان کو جواب دیا۔ پھر خدا نے آدمؑ سے کہا کہ وہ فرشتوں سے گفتگو کریں۔ اس کے بعد بہشت میں آدمؑ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں بھی خدا اور شیطان کے درمیان گفتگو جاری رہی۔

علاوہ ازیں ہم سب اس بات سے بھی واقف ہیں کہ (قرآن کی روایت کے مطابق) خدا نے بہت سے انبیاء سے بھی گفت وشنید کی ہے۔

بنابریں گفتگو اور مکالمہ ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جس کی طرف خدا بھی متوجہ کرتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اپنے انبیاء کو گفتگو کی ہدایت کی تا کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں سے ایمان، کفر، توحید، شرک اور دوسرے عقیدتی موضوعات پر گفتگو کریں، ان کے اعتراض سنیں اور ان اعتراضات کے جواب دیں۔

بنابریں ہماری نظر میں گفت وشنید دعوت اور تبلیغ کا قرآنی اسلوب ہے، اس اسلوب کو خداوند عالم نے جدال کا نام دیا ہے ''وجادلهم بالتی هی احسن'' (اور اہل کتاب سے بہترین طریقہ سے بحث کیجیے۔ النحل: ۱۲۵) ''ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن'' (اور اہل کتاب سے مباحثہ کرو، مگر اس انداز سے جو بہترین انداز ہے۔ عنکبوت: ۴۶)

اس بارے میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر گفتگو کی گئی ہے اور ہم نے اپنی تالیفات مثلاً ''الحوار فی القرآن'' اور ''اسلوب الدعوة فی القرآن'' میں اس بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

گفتگو اور باہمی مباحثہ ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ دوسروں تک اپنے افکار و خیالات پہنچائے جاسکتے ہیں اور ان کی آراء ونظریات سے آگاہ ہوا جاسکتا ہے، تا کہ تفاہم باہمی پیدا ہو اور دوسروں کو اپنی فکر قبول کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔

ہم جب خود آپ سے آپ غور وفکر کرتے ہیں تو وہ بے صدا ہوتا ہے۔ ہمارا یہ مباحثہ دوسرے نہیں سن پاتے۔ اس کے برخلاف جب ہم دوسروں کے سامنے مباحثہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر غور وفکر کرتے ہیں تو یہ باہمی غور وفکر سنائی دینے والا ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ افکار کا تبادلہ کریں، مل بیٹھ کر سوچ بچار کریں کیوں کہ مسلسل اجتماعی غور وفکر ہمیں بہت سے فکری اور ثقافتی موضوعات میں مطلوبہ نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور گفتگو اور باہمی مکالمہ کا اسلوب نتائج کے حصول کا مختصر ترین راستہ ہے جسے اسلام نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

سوال: آپ نے ایک جگہ کہا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم مستقبل میں اور شدید ہو جائے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ تہذیبوں کے درمیان گفتگو اور مکالمہ پر یقین نہیں رکھتے؟

جواب: ہمارے خیال میں مغرب پر حاکم حکومتوں نے ہمارے لیے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ اپنے تبلیغاتی ذرائع سے مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کر کے اہل مغرب کے اذہان کو اپنے زیرِ اثر کر لیا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مخاصمانہ رویہ اپنایا ہوا ہے، ان کا مقصد خود مسلمانوں میں اسلام کو ختم کرنا یا بعض اسلامی عناوین کو اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول اور مسلمانوں پر تسلط کے لیے استعمال کرنا ہے۔ کلی طور پر مغرب اسلام سے مکالمہ اور گفتگو کے لیے کوشاں نہیں۔ کیوں کہ اس کے سامنے اہم بات یہ نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ وہ یہ نہیں جاننا چاہتا کہ حقیقت اسلام کے پاس ہے یا غیر اسلام کے پاس؟ بلکہ مغرب کا مسئلہ محض اور محض اپنے مفادات کا حصول ہے۔ مغرب تمام وسائل اور ذرائع استعمال کر کے عالم اسلام سے اپنے مفادات پورے کرنا چاہتا ہے۔ بنابریں جب تک مغرب میں یہ ذہنیت کارفرما ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس روش کو اختیار کیے ہوئے ہے، اس وقت تک تہذیبوں کے درمیان

گفتگواور مکالمہ مشکل نظر آتا ہے۔

ہم مغرب سے گفتگو کو مسترد نہیں کرتے، ہم اب بھی اس مغرب سے گفتگو کا پرچار کرتے ہیں جو فکری اور ثقافتی گفتگو کے قواعد اور آداب کو مانتا ہو، اور مغرب کے ایسے لوگوں سے گفت وشنید کو مفید سمجھتے ہیں جو وہاں کیے جانے والے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر نہ ہوں۔ ہم ان سے گفتگو پر بہت اصرار کرتے ہیں کیوں کہ گفتگو ہی کے ذریعے اہل مغرب کی عقلوں اور افکار کو کھولا جا سکتا ہے اور ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مغربی معاشروں میں اسلام کا تعارف کرا سکتے ہیں اور انہیں اسلام کی طرف بلا سکتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اہل مغرب سے فکری اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ اور بلا تعصّب مکالمہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بحث کا آغاز کرنے کا بہترین موقع ثابت ہوسکتا ہے۔

ہم اہل مشرق کے لیے دو چیزیں تکلیف دہ ہیں، ایک تعصب اور دوسرا متاثر ہونا جو دوسروں کی بات قبول کرنے کی آمادگی کو (حتیٰ کہ گفتگو کی سطح پر بھی) ختم کر دیتا ہے۔

بنابریں میرا خیال ہے کہ گہری علمی ذہنیت کے ساتھ اور ایسے مغربی انسان کی عقلانی ذہنیت سے قریب ہو کر جس کے دل میں سابقہ تاریخ کے حوالہ سے کوئی کینہ نہ ہو، گفتگو کے میدان میں آنا اہل مغرب کو اسلام سے آشنا کرنے اور انہیں اسلام کا گرویدہ بنا لینے کا ایک مناسب موقع ہوگا۔

سوال: ہم دیکھتے ہیں کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر مطمئن ہے **کل حزب بما لدیھم فرحون** (اور ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر خوش اور مگن ہے۔ مومنون: ۵۳) اور ہر تہذیب اپنے سرمائے پر نازاں اور اس کے بارے میں متعصب ہے۔ ایسی صورت میں گفتگو کس طرح کی جاسکتی ہے؟

جواب: ہمارے خیال میں گفتگو کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے۔ ایسا انسان جو صاحبِ فکر وشعور ہو اور کسی نفسیاتی الجھن (complex) کا شکار نہ ہو وہ اپنے مخصوص دائرہ فکر سے دوسرے دائرہ فکر میں منتقل

ہوسکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے بعض دانش ور (جیسے فرانس کا روژہ گارودی) اسلام کے بارے میں مغرب کے پھیلائے ہوئے غلط تصور کو خاطر میں لائے بغیر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ایسے نمونوں کو ہم اہل مغرب کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے حقیقی امکان کی ایک مثال سمجھ سکتے ہیں۔

پس یقیناً یہ امکان موجود ہے کہ ایک مغربی انسان اپنے مارکسی یا مسیحی عقیدے سے دستبردار ہو کر اسلام قبول کر لے۔ پس اپنے گروہ سے لگاؤ میں اگر تعصب شامل نہ ہو تو یہ کوئی مشکل نہیں۔ گروہ پرستی اس وقت مشکل کھڑی کرتی ہے جب وہ افراد کو اپنے گروہ میں مقید کرنے کا موجب ہو، کسی کی بات سننے پر تیار نہ ہونے دے اور آزادانہ غور و فکر کی اجازت نہ دے۔ جیسے کہ بہت سے لوگ خود کو اپنی ثقافت میں محدود کر لیتے ہیں اور دوسروں کی کسی چیز کو سننے اور پڑھنے پر تیار نہیں ہوتے۔

سوال : کیا تہذیبوں کے درمیان گفتگو میں عالم اسلام کے پاس قوی عنصر موجود ہیں۔ اگر ہیں تو وہ عناصر کیا ہیں؟

جواب : ہمارا قوی اور طاقتور عنصر ''فکر اسلامی'' ہے، البتہ فکر کے لیے ایسے مفکرین ضروری ہیں جو دوسروں کے سامنے اسلام پیش کرتے ہوئے ان قوی عناصر سے استفادہ کرنا جانتے ہوں۔

اس سلسلے میں عالم اسلام کو جو مشکل درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ علمائے اسلام اور دانشوروں کی سرگرمیاں ان علاقائی ضروریات سے متاثر ہیں جن میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ عالمی تناظر میں اسلام کے بارے میں نہیں سوچتے اور اس پہلو سے غور و فکر نہیں کرتے کہ اسلام کا پیغام عالمگیر ہے اور دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے۔ جب کہ قرآن کریم اپنے رسول کو ''**کافة للناس**'' (تمام لوگوں کے لیے) اور عالمین کے واسطے رحمت کے طور پر پکارتا ہے۔

بنابریں ہمارے خیال میں اس بات کی ضرورت ہے کہ گہرا غور و فکر کیا جائے اور دیکھا جائے

کہ اسلام عصرِ حاضر اور آج کے انسان کی ضروریات اور تقاضوں کا کیا حل پیش کرتا ہے اور پیچیدہ مشکلات اور مسائل کے بارے میں کیا پروگرام رکھتا ہے۔

جب ہم اسلام کو عالمی دین کے طور پر پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور ایک ایسے دین کی صورت میں سامنے لاسکیں گے جو عالمی سطح پر مسائل کے حل پر قادر ہے تو اسلام کے دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں قوی اور طاقت ور ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

سوال: کیا آپ آج کے عالم اسلام میں کسی متعین تمدن سے واقف ہیں؟

جواب: جب ہم اس نقطہ نظر سے عالم اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ایک مبہم تمدن کا مشاہدہ کرتے ہیں جو نہ اسلامی تمدن ہے نہ بدوی اور نہ ہی مغربی "فيها من كل فاكهة زوجان"

سوال: ہم اس حال کو کیوں پہنچے اور مغرب علم و دانش اور ٹیکنالوجی کی بلندیوں اور سماجی ترقی میں اس قدر آگے کیسے نکل گیا؟

جواب: آپ کے اس سوال نے مجھے نجفِ اشرف کے دو دوستوں کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو کی یاد دلا دی۔ ان میں سے ایک دوست مرجعیت کے بلند مقام کو پہنچ چکا تھا جب کہ دوسرا دوست ایک عالم دین ہی بن پایا تھا۔ پیچھے رہ جانے والے دوست نے اپنے مرجع دوست سے سوال کیا کہ ہم نے حصولِ علم کا ایک ساتھ آغاز کیا، ایک ہی حلقۂ درس ہم دونوں کا تھا، اس کے باوجود آپ نے یہ مقام کس طرح حاصل کر لیا اور میں اتنا پیچھے رہا؟ ان مرجع نے جواب دیا: اے شیخ! ہم دونوں نے سفر شروع کیا، میں نے روشنی میں راستہ بنایا اور تم وہیں کھڑے رہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اس پسماندگی اور بدحالی سے نجات کی راہ کیا ہے؟

جواب: راہ یہ ہے کہ جس راستے پر دوسرے چلے ہیں ہم بھی وہی طے کریں۔ ہمیں اسلامی تاریخ سے بہت سے سبق لینے چاہییں۔ اسلام نے سوسال سے بھی کم عرصہ میں ایک نیا تمدن ایجاد کیا، ہم اسی تمدن کو آج بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے علمی اور تحقیقی مراکز میں بہت

سے مسلمان مصروفِ کار ہیں جن کا سائنسی انکشافات اور ایجادات میں ہاتھ ہے۔ ان میں سے بہت سے مغربی سائنسدانوں کے ہم پلہ ہیں، بلکہ بعض حالات میں ان سے بہتر ثابت ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کی جانب سفر کے لیے گرانقدر صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہیں، بشرطیکہ اسلامی ممالک میں علمی سرگرمیوں کے لیے مناسب مواقع فراہم کیے جائیں۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی حکومتیں اور وہاں کا حاکم طبقہ ذہانتوں کو فرار پر مجبور کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں یہ اذہان ان مغربی ممالک میں جا پہنچتے ہیں جو انہیں گرم جوشی کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، انہیں خریدتے ہیں اور اپنے علمی و تحقیقی مراکز میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان حکومتوں کی طرف سے جہلاء (اور بے مصرف لوگوں) کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جاتی ہے، لیکن صاحبانِ علم اور موجدین کو مناسب مواقع فراہم نہیں کیے جاتے۔

سوال: آپ کی نظر میں اسلام کی کامیابی کا راستہ کیا ہے۔ کیا اسلام کی کامیابی طاقت کی منطق سے وابستہ ہے یا منطق کی طاقت سے؟

جواب: ہمارے خیال میں دونوں باتیں ضروری ہیں۔ ہمیں منطق کی طاقت سے بھی لیس ہونا چاہیے تاکہ دوسروں کی منطق کا مقابلہ کر سکیں، کیوں کہ دوسرے بھی علمی اور فکری لحاظ سے ایک منطق کے مالک ہیں۔ ہمیں اپنی طاقت ور منطق سے ان کی منطق کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اغیار سیاسی، عسکری اور اقتصادی قوت کے مالک ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ ہم بھی طاقت کی منطق سے استفادہ کریں جیسا کہ اس آیہ کریمہ میں ہمیں حکم دیا گیا ہے ''**واعدوا لهم ما استطعتم من قوة**'' (اور تم سب ان کے مقابلہ کے لیے امکانی قوت کا

انتظام کرو۔ انفال: ۶۰) کیوں کہ دوسروں کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت ہی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہ ممکن ہے دوسرے اپنی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ہم پر تسلط کے حصول کا ارادہ رکھتے ہوں۔

بنابریں ہم منطق کی طاقت کی بھی حمایت کرتے ہیں اور طاقت کی منطق کے بھی قائل ہیں۔ البتہ اس اصول کی روشنی میں جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے، یعنی کسی کے حق کو پامال نہ کیا جائے، بلکہ صرف اسلام اور مسلمین کا تحفظ پیش نظر ہو۔

سوال: آپ کے خیال میں تہذیبوں کے مابین مکالمہ کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں؟

جواب: تہذیبوں کے مابین گفتگو کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تہذیبوں کے پیروکار ایک دوسرے کو سمجھیں گے، کیونکہ تہذیبوں کی ایک دوسرے سے دوری اور ان کے مابین عداوت اور باہمی روابط و تعلقات کا نہ ہونا تہذیبوں کے ماننے والوں کو ایک دوسرے سے آگاہ نہیں ہونے دیتا۔

بنابریں تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے لیے اگر طبیعی طور پر حالات سازگار بنائے جائیں اور میدان ہموار کیا جائے تو اس طرح تفاہم باہمی کی فضا پیدا ہوگی اور یہ امر بعد کے مرحلہ میں مشترکہ نکات تک پہنچنے اور ان کی بنیاد پر باہمی تعلقات برقرار کرنے کا امکان پیدا کر دے گا۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآنِ کریم کلمة سواء (مشترک بات) کہتا ہے۔ اس راستہ سے اختلافی مسائل پر گفتگو کا آغاز ہوگا اور قدرتی بات ہے کہ باہمی عداوت اور چپقلش سے دور رہتے ہوئے مشترکہ نکات پر گہری علمی گفتگو ان نکات پر مفاہمت پر منتج ہوگی۔

ضروری نہیں کہ ایک تہذیب کے تعلقات دوسری تہذیب سے ہمیشہ نزاع و چپقلش ہی کی حالت میں رہیں اور اس بنیاد پر وہ ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے رہیں، بلکہ مشترکہ نکات کی اساس پر بہتر حالات کی دستیابی کے لیے باہمی گفت وشنید کی بنیاد پر بھی تعلقات استوار کیے جا سکتے

ہیں۔اس ذریعہ سے وحدت اور عالمی صلح کے قیام کے لیے مناسب مواقع میسر آسکتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین گفتگو کے بکثرت مفید نتائج ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر تہذیب دوسری تہذیب سے وہ چیزیں اخذ کر سکے گی جو اس کے فکری اصولوں سے موافق ہوں۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کے مقابلہ میں عالم اسلام کی پسماندگی کا ایک سبب یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں افکار و نظریات اور فہمِ اسلام کا اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ہیں۔اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ہمارے خیال میں اس پسماندگی کا سبب فہم اسلام میں اجتہاد کا اختلاف نہیں، بلکہ اس کا سبب تعصب ہے، فکری تعصب ہے جو انسان پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے فہم کا انکار کرنے لگتا ہے، اپنے آپ کو حقیقت مطلق کا مالک سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کی کسی بات کی ذرہ برابر حقیقت کا قائل نہیں ہوتا۔تعصب یہ ہے کہ انسان فریقِ مخالف کے افکار و خیالات کے مبانی اور ماہیت کو سمجھنے کے لیے گفتگو سے انکار کر دے۔

یہ تعصب آج بھی بعض ایسے علماء میں نظر آتا ہے جو روشن فکر نہیں اور دوسروں سے گفتگو، ان کی بات سمجھنے اور مقابل فریق کی حیثیت دینے کے بارے میں شرح صدر کے مالک نہیں۔ یہ لوگ اجتہادی مسائل کا سامنا یا تو مطلق منفی یا مطلق مثبت ذہنیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ بنابریں آراء و نظریات کا اختلاف نہیں، بلکہ تعصب ہے جس نے اسلامی معاشروں کو زوال سے دوچار کیا ہے، کیونکہ کسی معاشرے میں آراء و افکار کی کثرت اور اختلاف معاشرے کی بنیادوں کو منہدم نہیں کر سکتے۔مختلف آراء و نظریات کا اظہار تو معاشرے کی ترقی اور وہاں فکری سرمائے کی فراوانی کا سبب ہوتا ہے۔

پھر اجتہادی اختلافِ رائے صرف اسلامی معاشروں ہی میں نہیں پایا جاتا، بلکہ یہ مغرب میں بھی موجود رہا ہے اور اب بھی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں بھی بعض مفکرین شہنشاہیت کو

ماڈل قرار دیتے ہیں اور اسے عدل وانصاف کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے مفکرین جمہوریت کو عدالت کے قیام کا فطری ذریعہ کہتے ہیں، کچھ عرصہ پہلے تک بعض لوگ آمریت کو بہترین طرز حکومت سمجھتے تھے اور بعض دوسروں کے خیال میں جمہوریت ہی حکومت کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس مسئلہ پر مغرب میں مسلسل نزاع رہا ہے اور طویل عرصہ تک بحث مباحثہ ہوا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خود مغرب ہے جس نے اقتصادی میدان میں سوشلزم اور کیپٹل ازم کو متعارف کرایا ہے۔

لہذا ہم کہتے ہیں کہ اجتہاد کا اختلاف مشکل کا سبب نہیں، بلکہ مشکل پیدا کرنے والی چیز تعصب اور جمود ہے۔ کیونکہ اہل مغرب طرزِ حکومت، اقتصادی مکاتب اور انسانی حقوق کے بارے میں تمام تر اختلافِ رائے کے باوجود ایسے مضبوط نظاموں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن میں مختلف افکار وآراء کا احترام کیا جاتا ہے اور وہاں سیاسی، اقتصادی اور مذہبی اختلاف نظر کوئی خطرہ نہیں رکھتا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے فقہی، سیاسی، فلسفی اور کلامی اختلاف سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ایسا ماحول پیدا ہی نہیں کیا جس میں اطمینان کے ساتھ مختلف فکری نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا جا سکے۔ کیونکہ اب بھی اسلامی معاشروں کے سربرآوردہ افراد کے ذہنوں پر شخصیت پرستی حاوی ہے، یہاں تک کہ وہ دوسروں کو مخالف آراء پیش کرنے تک کی اجازت نہیں دیتے۔

ہمیں قرآنی شیوہ کی پیروی کرنی چاہیے جو دشمنانِ اسلام سے بھی انتہائی گہرے اور ظریف اسلوب اور نہایت عاقلانہ طریقہ سے گفتگو کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے" **ھاتو ابرھانکم ان کنتم صادقین** "(اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل لے آؤ۔ البقرہ:۱۱۱)" **وانا اوایاکم لعلی ھدی اوفی ضلال مبین** "(ہم یا تم یا تو ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں۔ سبا:۲۴)" **ھانتم ھولاء حاججتم فیما لکم بہ علم فلم تحاجون فیما لیس لکم بہ علم** "(اب تک تم نے ان

باتوں میں بحث کی ہے جن کا کچھ علم تھا تو اب اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ آل عمران:٦٦)۔

مغرب نے اپنی زندگی کے بعض اطوار میں اسلامی قدروں کو اپنایا اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ان امور میں کافروں کی منطق اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض افراد اپنے مخالفین کا سامنا کرتے ہوئے اس طرزِ عمل کی پیروی کرتے ہیں جو کفر پیشہ اقوام انبیاء کے خلاف اپناتی تھیں۔

سوال: ہم یہاں مغربی اور اسلامی معاشروں کے اندر پائے جانے والے اختلافات کی ماہیت کو پیش نظر رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ مغربی معاشروں میں پایا جانے والا اختلاف اکثر سیاسی افکار اور فلسفوں کے بارے میں ہے اور وہ سب اس بنیادی نکتہ پر متفق ہیں کہ ان کی آراء و نظریات حقیقت سے نسبتاً (relatively) نزدیک ہیں اور ممکن ہے یکسر حق نہ ہوں، لیکن اسلامی معاشروں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اکثر مذہبی نوعیت کے ہیں اور اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء مقدس اور قطعی سمجھی جاتی ہیں۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ مغرب میں بھی مقدس امور کے بارے میں ہر دور میں اختلاف رہا ہے۔ مسیحی فرقوں کیتھولک، آرتھوڈکس اور پروٹسٹنٹ کے درمیان انتہائی شدید اختلافات رہے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ آیا آپ کی شخصیت خدائی ہے یا بشری۔

اہل مغرب بھی گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں ہی کی مانند باہم برسرپیکار رہے تھے، لیکن بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عقیدتی اختلاف کو ان حدود میں رکھا جائے جو ان کے لیے مشکل کا سبب نہ بنیں۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ فقیہ جس حکم کا استنباط کرتا ہے، اس کے بارے میں اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ

یہی حکمِ خدا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اس کا اخذ کردہ حکم ظنی ہے قطعی نہیں۔ کیوں کہ اس کے استنباط کے مبانی ظنی مقدمات سے حاصل شدہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ جس چیز کو وہ بیان کرتے ہیں وہ پست ترین مقدمات کے تابع ہے۔

جب فقیہ یہ جانتا ہے کہ اس کی مورِدِ اعتماد حجت اور دلیل کا نتیجہ حتمی نہیں، بلکہ ظنی ہے تو قدرتی بات ہے کہ اس کے پاس دوسرے کی رائے کو درست اور حقیقت پر مبنی سمجھنے کا امکان موجود ہے۔

ان دو اقوال کے درمیان بہت فرق ہے۔ ایک یہ کہ اسلام حقیقت مطلق کا مالک ہے اور دوسرا یہ کہ مجتہدین حقیقت مطلق کے حامل ہیں۔ یہ کہنا کہ مجتہدین کی رائے حقیقت مطلق ہے مصوبہ کا عقیدہ ہے، لیکن فقہا خصوصاً شیعہ امامیہ فقہاء تصویب کا عقیدہ نہیں رکھتے اور اپنے آپ کو مصیب قطعی نہیں سمجھتے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں مشہور ہے کہ ''خدا کا ایک ہی حکم ہے جس نے اسے دریافت کرلیا، اس نے دریافت کیا اور جس نے دریافت نہیں کیا، اس نے غلطی کی ہے۔''

کبھی تو مجتہد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جو چیز اس نے اجتہاد کے ذریعے اخذ کی ہے، اس کے بارے میں اس پر حجت تمام ہوگئی ہے۔ یہ کہنے اور حکم کو قطعی اور حتمی سمجھنے میں بہت فرق ہے، لیکن اگر اس کے برعکس کہا جائے (کہ مجتہد نے جو رائے اخذ کی ہے وہ حتمی اور قطعی ہے) تو پھر مجتہدین کی آراء میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کی کیا تفسیر کی جائے گی؟ بنابریں کس طرح ممکن ہے کہ ایک مجتہد دوسرے مجتہد کی صرف اس بنا پر تکفیر کرے کہ اس نے استنباط میں غلطی کی ہے؟ (جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ اس نے استنباط کے دوران اجتہاد کے معروف طریقوں کو اختیار کیا ہے۔)

ایسے لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی رائے حقیقت مطلق ہے، وہ کم وبیش پسماندہ ذہنیت کے مالک ہیں، کیوں کہ وہ اس جانب بھی متوجہ نہیں ہوتے کہ ان کے عمل کا اسلوب ظنی ہے، قطعی اور یقینی نہیں۔

اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان محققین (خواہ وہ فقہ سے متعلق ہوں یا کلام

سے) کی مشکل یہ ہے کہ وہ فقہی یا کلامی اختلاف کے بارے میں افراط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سوال: کیا ہم قرآنِ کریم یا دوسرے اسلامی مصادر سے آزادی کا مفہوم معلوم کر سکتے ہیں؟

جواب: انسان کی فکری آزادی کے مسئلے کو قرآنِ کریم سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کلامِ الٰہی میں آیا ہے کہ "**وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیمن و من شاء فلیکفر**" (اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ الکہف:۲۹) "**انا ھدینا ہ السبیل اما شاکر او اما کفورا**" (یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دے دی ہے، چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران کرنے والا ہو جائے۔ الانسان:۳)

بنابریں انسان سوچ بچار، فکر و رائے میں آزاد ہے اور انسان کی صورت میں اس کی تخلیق اسی صورت میں بامعنی بھی ہے۔ اس بنیاد پر آزادی انسان کی ذات سے جدا اور علیحدہ کوئی چیز نہیں جسے دوسری ایسی چیزوں کی مانند چھینا جا سکے یا اس کے لیے ممنوع کی جا سکے (جو اس سے علیحدہ ہیں)۔ یہ انسان کے لیے ایک ذاتی امر ہے، کیوں کہ خداوندِ عالم نے اسے آزاد خلق کیا ہے۔

البتہ ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ کہ خداوندِ عالم انسان کی آزادی کا قائل ہونے کے بعد اسے یہ بھی باور کراتا ہے کہ یہ آزادی بے لگام آزادی نہیں، بلکہ ذمہ داریوں کے ہمراہ ہے اور اسے اس آزادی سے استفادے کے مثبت اور منفی نتائج کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

اس طرح یہ بھی طبیعی ہے کہ ہر نظام کو معاشرے میں عمومی نظم و نسق کی حفاظت کے لیے آزادی کے نتیجے میں سامنے آنے والے مثبت اور منفی نتائج پر گہری نگاہ رکھنی چاہیے، کیوں کہ بسا اوقات ایک شخص کی آزادی دوسرے لوگوں کی آزادی کے لیے ضرر رساں ہوتی ہے، البتہ اگر فکری آزادی سے یہ مراد لی جائے کہ لوگوں کو اپنے ہر طرح کے افکار حتیٰ کہ ایسے افکار کی نشر و اشاعت کی بھی آزادی دی جائے جو عقیدتی، شرعی یا مفہومی اعتبار سے اسلام یا اسلامی نظام کی مخالفت پر مبنی

ہوں تو ایسی فکری آزادی کے معاشرے پر مثبت یا منفی اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ پر تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے بہت سے فقہاء نے کتبِ ضلال کو پڑھنے، (سوائے اس صورت میں جب ان کا مطالعہ کر کے ان کا رد کرنا مقصود ہو) انہیں محفوظ رکھنے، اوران کی نشر و اشاعت کے حرام ہونے کے بارے میں گفتگو کی ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ عقل کہتی ہے کہ ان کتب کی حفاظت اور نشر و اشاعت باطل کی تقویت اور حق کی کمزوری کا سبب ہوتی ہے، جب کہ ان کتب کو محدود اور نابود کرنا حق کی تقویت اور باطل کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے اور عقل کی نظر میں حق کو تقویت دینا اور باطل کو کمزور کرنا واجب ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بہت سے فقہاء اپنے ظن و گمان ہی کو قرین عقل قرار دیتے ہیں۔ ہر ایک اسی چیز کو عقل سمجھتا ہے جسے اس کی ذہنیت اور تعلیم و تربیت عقلی قرار دیتی ہے، حتیٰ کہ ہم ایسے موارد بھی دیکھتے ہیں جب ایک فقیہ کسی ایک چیز کو عقلی سمجھتا ہے اور دوسرا فقیہ اس کے یکسر برخلاف چیز کو عقل کا فیصلہ قرار دیتا ہے۔

میرے خیال میں پرانے زمانے میں ایسے حالات تھے کہ لوگ افکار کو محبوس کرنے اور فکری آزادی سلب کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو جایا کرتے تھے، کیوں کہ اس وقت دنیا ایک محدود اور تنگ چار دیواری میں محصور تھی اور عالمی سطح پر کسی فکر کی نشر و اشاعت ممکن نہ تھی، اور قدرتی بات ہے، ایک فکر پر دباؤ اس کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے، لیکن آج دنیا ایک چھوٹے سے دیہات میں تبدیل ہو چکی ہے اور فکری آزادی کا مسئلہ ایک ایسے مسئلہ کی صورت میں ڈھل چکا ہے جو عالمی پیمانے پر انسانی حقوق میں سے سمجھا جانے لگا ہے اور کسی فکر پر دباؤ اور شدت کا استعمال اسے عالمی تشہیر کا موقع فراہم کر دیتا ہے (چاہے وہ فکر اس کی مستحق نہ ہو)، جب کہ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو بہت کم لوگ اس کی جانب متوجہ ہوتے۔ اگر اسلامی عقیدہ اور تعلیمات کی حفاظت کے لیے

سرگرم عناصر کسی ایسی فکر سے روبرو ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ بجائے دباؤ اور حملوں کے اسے دلیل و برہان سے رد کرنے کی کوشش کریں۔ بنابریں ہمارے خیال میں اگر اس مسئلہ کا غور اور گہرائی کے ساتھ عصرِ حاضر کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ کسی فکر پر جبر اور دباؤ کا استعمال اس کی تقویت اور اس کے مخالفوں کی کمزوری پر منتج ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف فکر کو آزاد چھوڑ دینا اس کے اثرات کی کمی اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ تنگ کرنے کا موجب ہوتا ہے اور بسا اوقات تو لوگ ان کی باتوں پر کان دھرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے چہ جائیکہ ان کی جانب کوئی رخ کرے۔

ہم نے لبنان، مصر اور عراق میں ہونے والے تجربہ کی بناء پر دیکھا ہے کہ ایسی کتابیں جن میں دین پر تنقید کی گئی ہے، جب دینی حلقوں نے ان کے خلاف مہم چلائی تو ان کتابوں کی مانگ میں اضافہ ہوا اور ان کے کئی کئی ایڈیشن طبع ہوئے ہیں، حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے بھی ان کو خریدا جن کی سطح کی یہ کتب نہ تھی، کیوں کہ ایسی صورت میں ان کتب کی پیشانی پر آزادیٔ اظہار کا لیبل چسپاں ہو گیا تھا۔ مثلاً مصر میں ایک مصنّف ہے جس کا نام ''نصر حامد ابوزید'' ہے، اس کی کتابیں بہت کم پڑھی جاتی تھیں، اس کے چاہنے والے بھی کم تھے، لیکن جب اس کی فکر کو روکنے کی کوشش ہوئی تو اس کی کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن چھپنے لگے، حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے بھی اس کی کتابوں کو خریدا اور انہیں پڑھا جو اس کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ دوسرا تجربہ عراق اور لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کا ہے۔ یہ پارٹی عراق میں سخت دباؤ میں تھی، لیکن اس کے باوجود پورے عراق پر چھا گئی۔ اس کے برخلاف لبنان میں کمیونسٹ پارٹی کو مکمل آزادی حاصل تھی، لیکن تقریباً ستر برس بعد بھی وہ ایک مختصر گروہ کے سوا کسی کو جذب نہ کر سکی، کیوں کہ لوگ مظلوم کے طرفدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی کتاب آزادانہ طور پر بازار میں آتی ہے تو بسا اوقات تو اس کا پہلا ایڈیشن ہی فروخت نہیں ہو پاتا اور اس کے بیش تر نسخے اسٹور ہی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔

بنابریں آزادی فکر کی بحث میں ہمیں آزادی دینے یا آزادی سے منع کرنے کے مثبت اور منفی نتائج کا گہری نظر سے جائزہ لینا چاہیے اور حکم عقل کے تحت مطلق پیمانے پر اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ مسائل کے حقیقی اثرات کے بارے میں غور وفکر کرنا چاہیے، خیالی اثرات کے بارے میں نہیں۔